بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے، یعنی اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اُس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے، اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی، اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں، اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی وجہد کو مرکوز کیا ہے، اور مسلمان جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ

کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو بحیثیت اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں۔

"آزادی پسند" علماء اور ان کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید براں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں

شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سردست اس کے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصورِ جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آ جائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے راستہ میں ان کو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (TECHNIQUE) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی بھی کچھ ایسی زیادہ ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس

کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آئے دن تک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سب سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُن کو کستی تھی، اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی ایک تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اُٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر کی کوئی حاجت ہے کہ اس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے

تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیحؑ سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیمؑ سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ در اصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی قسم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ در اصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو

اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر طے کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا، اسی لیے کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کرسکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے ان کو پیش کیا جاسکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہوسکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کرسکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہوسکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہوجائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنالیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لاکر جرمنوں کا ولیِ حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کرکے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہوگئے؟

فن لینڈ اور رومانیا کو روس سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنا ہوا ایک ایسا گروہ (GROUP) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابل تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (NATION STATE) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدابیر اختیار کر سکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کر سکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس یہ تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے، خون کے پیاسے دشمنوں میں سے اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے، سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں، اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح گھل گھل کر اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے قلت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا

ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے سہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے وہ سب حدود و بندشیں بھی انہوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کرلی ہوں جو ایک قلیل التعداد اور قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروؤں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اِس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کردینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں پر سے بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس

سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی ۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد وا غراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے ۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں ! اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے ! اگر ہم حیدرآباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اس کے بعد بھی یہ باور کرے گا کہ ہم اسلام کے نظریہ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے ۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری لوازمات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں، تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اٹھے ہیں ۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں ۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اُس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی ۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا ۔ بلا شبہ اس سے ہمیں بہت سے نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے ۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو ۔ سیدنا مسیح کے بقول جب جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی ۔

چند مہینوں سے اس رسالہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی ہے حتّٰی کہ ربیع الاول و ربیع الآخر کا مشترک نمبر رجب کے وسط میں شائع ہوا جس سے ناظرین رسالہ کا پیمانۂ صبر بالکل ہی لبریز ہو گیا اور دفتر میں شکایات کا انبار لگ گیا۔ اب اس تاخیر کا اصلی سبب ظاہر کرنے پر میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔

دراصل اس کا سبب وہ شدید مالی مشکلات ہیں جو پچھلے چند مہینوں سے اس رسالہ کو پیش آ رہی ہیں۔ دو تین سال اُدھر جن خیالات کی تبلیغ ان صفحات میں شروع کی گئی تھی اُن سے بعض جماعتیں ناراض ہوئیں تو بعض خوش بھی ہوئیں بعض نے مقاطعہ کیا تو بعض نے گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید بھی کہا لیکن وہ روش اصل مقصد کی محض تمہید تھی۔ جب تمہید ختم ہوئی اور اصل مقصد بے نقاب ہو کر سامنے آیا تو ہندوستان کی مختلف الخیال جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہ تھی جس کو اُس سے اتفاق ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ کے خریداروں کی تعداد بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنی شروع ہو گئی۔ پچھلے سات آٹھ مہینوں میں جن اصحاب کے نام فہرست خریداران سے خارج ہوئے ہیں ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر اس قلیل مدت کے اندر رسالہ کی آمدنی میں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے کی کمی واقع ہوئی ہے۔ ایک طرف آمدنی کا یہ نقصان اور دوسری طرف جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قیمت بڑھتے بڑھتے دوچند ہو گئی۔ ان دونوں اسباب نے مل جل کر وہ موانع پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے پرچہ کو بر وقت شائع کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان حالات کے اظہار کا مقصد محض ناظرین کی اُس پریشانی کو دور کرنا ہے جو اشاعت میں غیر معمولی تاخیر سے ان کو پیش آ رہی ہے۔ میں کسی سے ہمدردی یا اعانت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ جو لوگ میرے خیالات سے متفق نہیں ہیں وہ اگر اختلاف رائے کو برداشت کر سکیں اور اپنے مخالف کے نقطۂ نظر سے آگاہ رہنے کی ضرورت سمجھیں تو رسالہ کو خریدیں ورنہ بند کر دیں۔ اس امر کی توقع کسی کو مجھ سے نہ رکھنی چاہیے کہ محض رسالہ کو زندہ رکھنے کے لیے میں اس کی پالیسی میں کوئی ایسی ترمیم کروں گا جو لوگوں کو خوش کرنے والی ہو اور (کم از کم میرے علم کے مطابق) خدا کو ناخوش کرنے

والی ہو رہی ہے وہ لوگ جو میرے مقصد اور طرزِ عمل سے اتفاق رکھتے ہیں، تو اُن سے بھی میں کسی ہمدردی و اعانت کی درخواست نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر سے فتویٰ لیں کہ جس مقصد کے لیے میں کام کر رہا ہوں وہ مقصد حق ہے یا نہیں، اور جس راستہ پر چل کر میں نے دنیا بھر سے اختلاف مول لیا ہے وہ صراطِ مستقیم ہے یا نہیں۔ اگر ان کا ضمیر اثبات میں جواب دے تو انہیں خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کا فرض کیا ہے۔ وہ اپنے فرض کو محسوس کر کے ادا کریں تو عندی و عنداللہ مشکور ہوں گے۔ نہ محسوس کریں اور نہ ادا کریں تو میں اپنی حدِ وسع تک کام کرتا رہوں گا، کیونکہ میرے ایمان کی وجہ سے جو فرض مجھ پر عائد ہو چکا ہے اُس کی بجا آوری اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی میرا ساتھ دے۔

رسالہ کی کشتیٔ حیات کو ڈگمگاتے دیکھ کر بعض حضرات کا ماتھا ٹھنکتا ہے اور وہ اس خوف سے خریداری قبول کرنے یا جاری رکھنے سے انکار کرتے ہیں کہ کہیں بند ہو گیا تو ہمارے روپے مارے جائیں گے۔ اپنے عزیز مال کی حفاظت کا طریقہ وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں اور انہیں پورا حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں اس کی حفاظت کریں۔ البتہ ان کی معلومات کے لیے میں صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ تجارتی اغراض کے لیے جاری نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ایسے مقصد کی خدمت کے لیے جاری کیا گیا ہے جو عین میری زندگی کا مقصد ہے۔ اس لیے جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت باقی ہے میں ہر ممکن محنت و کوشش سے انشاء اللہ اس کو جاری رکھوں گا۔ اور بالفرض اگر اس کا جاری رکھنا میری حدِ امکان سے باہر ہو گیا تو میں ہر شخص کو اُس کا پورا پورا حق واپس کر دوں گا۔ میرے اس وعدے پر جس کا جی چاہے اعتماد کرے اور جس کا جی نہ چاہے نہ کرے۔ بہر حال میں اپنی ذمہ داری کو خود محسوس کرتا ہوں، مجھ میں اتنی ہمت طاقت نہیں ہے کہ لوگوں کے حقوق کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے دنیا سے آخرت کا سفر کر سکوں۔

میری کتابوں پر "سلسلۂ مطبوعات ادارہ دارالاسلام" کے الفاظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ التباس پیش آ رہا ہے کہ پٹھانکوٹ میں جناب صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب نے دارالاسلام کے نام سے جو ادارہ قائم کر رکھا ہے شاید اس سے ان مطبوعات

کا کوئی تعلق ہوگا۔ رفع التباس کے لیے مجبوراً مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ادارہ پٹھان کوٹ والے ادارہ سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس کے مقاصد، اس کا دستور العمل اور اس کا دائرہ، سب کچھ اُس سے الگ ہے۔ اس کا عارضی مرکز لاہور ہے، میں اس کا عارضی صدر ہوں، اور اس کے ارکان و معاونین سختی کے ساتھ اسی دستور العمل پر کاربند ہیں جو دو سال قبل ترجمان القرآن میں شائع کیا گیا تھا۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں پٹھان کوٹ والے ادارے کے ٹرسٹیوں میں شامل ہوں اور اس سے میرا اتنا ہی تعلق ہے جتنا دوسرے ٹرسٹیوں کا ہے۔ مجھے ابتدا ہی میں یہ اندیشہ تھا کہ ایک نام کے دو اداروں کے ہونے سے خواہ مخواہ لوگوں کو التباس پیش آئے گا، اسی لیے میں نے چودھری صاحب سے عرض کیا تھا کہ اپنے ادارے کے نام میں کچھ تغیر کر دیں، مگر انہوں نے نام کا تغیر مناسب نہ سمجھا۔ خیر، اب مجھے امید ہے کہ اس تصریح کے بعد کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔

لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار "اجتماع" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اُس کے مالک یا ایڈیٹر صاحب نے اب سے چند مہینے پہلے مجھ سے مضامین کی فرمائش کی تھی، اور میں نے معذرت طلب کرتے ہوئے ان کو اجازت دے دی تھی کہ "ترجمان القرآن" میں میرے جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں سے جس کو پسند فرمائیں اپنے ہاں نقل کریں۔ اس اجازت کو انہوں نے کافی سمجھ کر اخبار کی پیشانی پر میرا نام اس طرح درج فرما دیا کہ گویا مجھے اس کے زمرۂ ادارت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لطف یہ ہے کہ مجھے پہلی اشاعت کے سوا ان کے کسی پرچہ کی زیارت تک کا فخر بھی حاصل نہ ہوا۔ میرے متعدد دوستوں نے مجھے توجہ دلائی کہ اس غلط فہمی کو رفع کروں جو اس طرح ایک اخبار کی ذمہ داری میں بلا وجہ شریک کر لیے جانے سے میرے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ مگر میں اس امید پر معاملہ کو ٹالتا رہا کہ شاید اس کے اربابِ اہتمام کو خود اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس ہو جائے، یا کم از کم وہ ایک گوشہ نشین گمنام آدمی کے نام کو اپنے لیے غیر مفید پا کر خود ہی چھوڑ دیں۔ افسوس ہے کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اب میں مجبور ہو کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس اخبار سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے